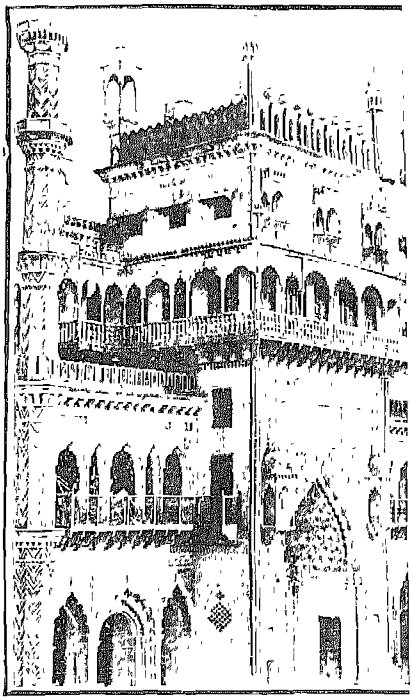
1185

بشیر پاشا سیریز



تذکرہ

شمس العلما خواجہ حالی مرحوم

مرتبہ

محمد امین زبیری

اسلامیہ ہائی اسکول (اٹاوہ)

Title and inside Blocks printed by Taj Printing Works Fort Bombay



تعنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جوان مرگ
بشیر پاشا مرحوم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ کے نام سے معنون
کرتا ہوں۔ جس کی زندگی اور جس کی تعلیم و تربیت کا مقصد
قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیل تعلیم کر کے اپنی
زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانان قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور اُن کے حوصلہ بڑھانے کے لئے ان مشاہیر قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہے۔ اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے عظم الرجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شایع کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور ہمدردی میں صرف کی ہیں ان کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شایع کئے جاتے ہیں اور میں اُن عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اُٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔

میں اپنے پرجوش نوجوان دوست سید عبد الجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں اُن کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔ اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو وہ بھی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد ایمان حسین بی اے۔
ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول

(شمسی مشین پریس آگرہ میں محمد بشیر الدین خاں کے اہتمام سے چھاپا گیا)

شمس العلماء خواجہ حافظ الطاف حسین صاحب حالی[۵۱]

(۱)

مولانا حالی پانی پت کے ایک مشہور عالی نسب انصاری خاندان کے رکن اور خواجہ ایزد بخش کے فرزند اصغر تھے۔

اُن کی ولادت ۱۲۵۳ھ میں ہوئی تھی اور ہنوز ۹ سال کی عمر بھی پوری نہ کی تھی کہ پہلے باپ کے ظلِ عاطفت سے اور پھر ماں کی آغوشِ شفقت سے محروم ہو گئے۔ لیکن اُن کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے باپ سے زیادہ شفقت کے ساتھ اُن کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت پر توجہ رکھی۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کرایا گیا اور پھر درسی کتابیں شروع ہوئیں۔

مولانا نے فارسی کی تعلیم سید جعفر علی صاحب سے حاصل کی جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے تھے اور فارسی میں استعدادِ دستگاہ اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ تعلیم مذہبی اور عربی کی تکمیل مولوی حاجی ابراہیم حسین

---

[۵۱] میں مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف تاریخ تمدن اسلام بھوپال و مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی کا بے انتہا شکر گذار ہوں کہ جناب موصوف نے متعدد عجیب واقعات لکھوا کر تذکرہ کی تکمیل میں امداد دی تھی۔

صاحب انصاری اور حاجی قاری مولوی عبدالرحمان صاحب انصاری سے کی قاری صاحب جیّدؔ عالم اور محدث تھے اور قرآن مجید کا خاص طور پر درس دیتے تھے۔

۱۷ سال کی عمر میں مولانا کی شادی اپنے کنبے قبیلے میں ہو گئی یہ حسن اتفاق تھا کہ سسرال کی خوشحالی کے باعث متاہلانہ زندگی کے ترددات سے ان کو سابقہ نہیں پڑا اور اُن کی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اسی سلسلہ میں کچھ عرصہ دہلی میں بھی بسر کیا۔ دہلی میں اگرچہ مسلمانوں کی عظمت و شوکت اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب چکا تھا تاہم شفق کی کچھ روشنی باقی تھی اور اہل علم و فضل اور صاحبان کمال کا مجمع موجود تھا مولانا نے اِن علماء و فضلا سے علمی استفادہ کیا۔

فطرت نے اُن کے خمیر میں اُن جوہروں کو بھی ودیعت کیا تھا جن سے انسان اصلی شاعر بنتا ہے لیکن اکتساب علوم کے زمانہ تک وہ جوہر مخفی رہے۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو باکمال ارباب سخن کی صحبتوں نے ان جوہروں کو بھی چمکایا اور مشق سخن کا آغاز ہوا۔

اس کی نسبت خود مولانا نے کانپور میں مولوی عبدالرزاق صاحب سے فرمایا تھا کہ "قلعہ معلّے کے دیوان عام میں جو مشاعرہ ہوتا تھا وہاں میں نے

غالب کو فارسی اور اردو غزلیں پڑھتے سنا اس سے مجھے شاعری کا شوق ہوا۔"

لیکن یہ صحبتیں اکتساب معاش کی فکروں کی وجہ سے جلد ختم ہو گئیں اور مولانا ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار میں ملازم ہو گئے جس کو ۱۸۵۷ء کی پریشانیوں میں ترک کرنا پڑا اور اس عام پریشانی اور دار و گیر کے چند سال منطق و فلسفہ اور حدیث و تفسیر کی تکمیل میں گزارے اس کے بعد اُنھوں نے نواب محمد مصطفےٰ خاں[۵۱] کے بچوں کی تعلیمی اور اتالیقی منظور کی اور ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۸ء تک جہانگیر آباد میں قیام رہا۔ نواب صاحب کی صحبت میں شعر و سخن کی ابتدا ہوئی اور جو کچھ لکھا اُس پر نواب صاحب نے اصلاح دی۔ لیکن قیام جہانگیر آباد کے زمانہ میں ہی غالب سے تلمذ حاصل کیا اور مستقل طور سے ان سے اصلاح لینی شروع کی۔ مرزا غالب اپنے سرمایہ

---

۵۱ دھلی کے رئیس اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ دار تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ، نواب محمد ضیاءالدین خاں "نیر درخشاں" اور مرزا غالب کے ہم جلیس اور ہم صحبت تھے۔ واقعۂ غدر کے بعد دھلی کی سکونت ترک کر دی اور جہانگیر آباد میں رہتے تھے۔

نحو شاگرد کی سخن فہمی، قابلیت علمی اور جودت و ذکاوت کی بہت قدر کرتے تھے اور شاگرد کے دل میں اپنے استاد کا انتہائی احترام اور شیفتگی و گرویدگی تھی۔ اور یہی اثر غالب کے مرثیہ میں سوز و گداز[۵۱] کی صورت میں نمایاں ہے۔

(۲)

جہانگیر آباد کی ملازمت ترک کرنے کے بعد گورنمنٹ پنجاب کے دارالکتب میں مامور ہو گئے جہاں یہ خدمت سپرد تھی کہ کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے مذاق کے مطابق درست کریں لیکن اس زمانہ میں یہاں ایسی سوسائٹی نہ تھی کہ ان کا دل لگتا۔ دہلی کے ارباب کمال کی صحبتوں کی یاد ہمیشہ مضطرب رکھتی تھی اس لئے وہ پریشان رہتے تھے۔ آخر یہ پریشانی دور ہوئی اور پھر وہ اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر مامور ہو کر دہلی میں ہی آ گئے، مگر قسمت پھر لاہور لے گئی اور ایچیسن کالج میں متعین ہوئے اب لاہور میں

---

۵۱ غالب کے انتقال کے دن جو ۲۔ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا مولانا حالی۔ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی مجروح تینوں شاگرد موجود تھے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اور تینوں نے مرثیے بھی لکھے لیکن مولانا حالی کا مرثیہ بہت پر درد اور بلند ہے۔

ارباب کمال کی سوسائٹی بھی قایم ہو گئی تھی۔

مولانا کو مشق سخن شروع کرنے کے تھوڑے سے عرصہ بعد ہی صف شعرا میں امتیازی جگہ مل گئی تھی مگر جب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قایم کی جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا اور اس میں مولانا نے قدیم رنگ کو چھوڑ کر برکھارت، نشاط امید، مناظرہ رحم و انصاف، حب وطن کے نام سے جدید طرز کی نظمیں پیش کیں جو جذبات کا مرقع اور واردات حالیہ کا آئینہ تھیں تو ان نظموں نے مولانا کا درجہ اپنے ہم نشینوں سے بہت بلند کر دیا۔ لیکن رفعت و کمال کے یہ ابتدائی مدارج تھے۔ وہ جوہر جو قدرت نے ان کو عطا کئے تھے ابھی تک جلوہ گاہ عام پر نہ آئے تھے۔

(۴)

سنہ ۱۸۷۶ء کے بعد ان کی طبیعت پر ایک قسم کی افسردگی طاری ہو گئی تھی اور شعر و سخن سے دل پھیکا ہو گیا تھا ان کے دل پر سرسید کی ملاقات سے ایک عجیب اثر پڑا اور اسی اثر سے وہ جوہر اس طرح چمکے جیسے پردۂ شب سے آفتاب عالمتاب

نمایاں ہوتا ہے جس کا سب سے بھلا کرشمہ "مدوجزر اسلام" تھا
جس نے حالی کے نام کا سکہ ہر ایک مسلمان کے دل پر قائم کر دیا۔
یہ مسدس ۱۸۷۹ء میں ختم ہوا اور مولانا نے خود ہی اُس کو
طبع کرا کے سرسید کے پاس بھیجا۔ سرسید نے اسکی رسید میں جو
خط مولانا کے نام بھیجا تھا جس کو اس مسدس کا تبصرہ اور مولانا
کی محنت و جانکاہی کا ایک قابل قدر اعتراف کہا جا سکتا ہے
وہ یہ تھا کہ :-

جناب مخدوم و مکرم من! عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدس
پہنچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ
سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی
اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار
دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی سے
یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے
کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے
جو مایۂ ناز شعرا اور شاعری ہے بالکل مبرا ہے۔ کیونکر ایسی خوبی، خوش
بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو
بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں

بیٹھتی ہے - نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے - پرانی
شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے - میری
نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی
محبت کا اثر سمجھتا ہوں - اگر میری شاعری کی کچھ بو اس میں
پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف
اشارہ ہے - بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے
اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا
کہ تو کیا لایا میں کہونگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہون
اور کچھ نہیں "خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے
فائدہ بخشے - مسجدون کے اامون کو چاہیئے کہ نمازون میں
اور خطبون مین اسی کے بند پڑھا کرین - آپ نے یہ نہیں ارقام
فرمایا کہ کس قدر کتابین چھپی ہین اور کیا لاگت لگی ہے اور فی
کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے
مجھے مطلع فرمائیے یہ بھی لکھیئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر
کتابین اب موجود ہین -

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا
جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے مین دل سے شکر کرتا ہون

مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشرافت ہوں اور رنڈیاں بلواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے ان استفسارات کا جواب جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔ والسلام۔

خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار

سید احمد

شملہ۔ پارک ہوٹل۔ ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء

اس مسدس نے چند ہی سال کے اندر اطراف و اکناف ملک
مین وہ شہرت و قبولیت حاصل کی کہ آج تک ہندوستان مین
کسی انسانی کتاب کو نصیب نہین ہوئی - مولود شریف کی
مجلسون مین جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہین - اور
واعظون کی زبان پر اس کے اشعار جاری رہتے ہین
اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہین
تقریرون اور تحریرون مین اثر اور دلچسپی پیدا کرنے کے
لیئے اس کے بند کے بند استعمال ہوتے ہین اور اس مین
شک نہین کہ اس مسدس نے مسلمانون کے تاریک دل
و دماغ کو منور کر دیا اُن کے مردہ احساسات مین روح پیدا
ہو گئی اور خفتہ جذبات بیدار ہو گئے - گذشتہ اور موجودہ
حالت کا مرقع سامنے رہنے لگا اور یہ حقیقت نفس الامری
ہے کہ سرسید کے مشن کو اس "مد و جزر اسلام" نے وہ تقویت
دی کہ اگر اس زمانہ کے تمام لٹریچر کیساتھ اس کا موازنہ کیا جائے
تو اسی کا پلہ بھاری ہوگا -

اس مسدس نے اس طبقہ پر بھی اثر ڈالا جو سرسید سے
وحشت کرتا تھا اور دور بھاگتا تھا یا جو مخالف تھا اور سرسید کی

کوششوں کا ردِ عمل کرتا تھا۔

تقریباً نصف صدی گذرنے پر بھی اسکی قبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا صدہا مرتبہ شایع ہوا اور ہنوز اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے[۵] ۔ بعض قومی مدارس میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ ممالک متحدہ کے سرکاری مدارس مین عام قبولیت کی وجہ سے نصاب تعلیم میں داخل رہا۔

مولانا نے پھر چھ برس بعد مقتضائے حال کے موافق ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں مایوسی کی جگہ امید کی جھلک تھی

اس مسدس کی قبولیت طبقہ وسطےٰ اور طبقہ غربا ہی تک نہیں ہے بلکہ امرا کے محلوں اور والیانِ ملک کے ایوانوں مین بھی اس کا نغمہ پرسوز سامعہ نواز ہے۔ علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج ہند جی، سی، ایس، آئی، جی، سی، آئی، ای، جی، بی، ای، فرمانروائے بھوپال نے

---

۵ سب سے اخیر اور نادر نسخہ وہ ہے جو منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس نے شایع کیا ہے اس میں فرہنگ کے علاوہ متعدد نقشہ جات ہین جو قابل دید ہین۔

تو اس مسدس کی وہ قدردانی[15] کی ہے جسکی نظیر مشکل ہے۔
غالباً ۱۹۱۱ء میں حضور ممدوحہ نے مندرجہ ذیل اشعار کی اپنے قلم مبارک سے آئل پینٹنگ کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تصویر بنائی جو حضور ممدوحہ کے حسنِ مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔

---

[15] حضور ممدوحہ کی قدر شناسی اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۱۶ء میں جب خواجہ سجاد حسین حالی میموریل اسکول کی امداد کے لئے بھوپال آئے اور ہر ہائینس سے ملاقات کی تو بہت سی باتیں ہوئیں سلسلہ گفتگو اس قدر طوالت ہوئی کہ خواجہ صاحب بخیال تصدیعہ اصل مقصد عرض نہ کر سکے۔ جب رخصت کی اجازت چاہی تو حضور ممدوحہ نے ارشاد فرمایا کہ :-

"خواجہ صاحب جس مقصد سے کہ آپ نے بھوپال کا سفر کیا ہے ابھی اس پر تو گفتگو ہی نہیں ہوئی میں مولانا حالی مرحوم کی یادگار قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض سمجھتی ہوں۔ میں نے ان کی قومی نظموں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ قومی اصلاح میں ان نظموں کا کیا اثر ہے۔ میں ضرور اس میموریل میں مدد دوں گی"

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

ملے کوئی ٹیلہ اگر ایسا اونچا کہ آتی ہو وہاں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اس پہ پھر اک خردمند دانا کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا
تو قوموں میں فرق اس قدر پائیگا وہ
کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن یاں بہت تازہ تر صورت باغ رضواں
بہت ان سے کمتر پہ سرسبز و خنداں بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں
نہیں لائے گو برگ و بار ان کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار ان کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جسکی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں جہاں آکے دیتا ہے رو ابر نیساں
تردد کی جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱ - چنانچہ شام ہی کو بارہ سو روپے سال کی امداد کا حکم خواجہ صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔

کہ اسلام کا باغ ویران یہی ہے

اس کے بعد مولانا اگست ۱۸۹۰ء میں علیگڈھ تشریف لے گئے متعدد دفعہ مدرستہ العلوم کو دیکھا اُس وقت اُس کی ابتدائی حالت تھی اس کے قیام کو چھ سال ہی گذرے تھے، عمارتون کی کچھ کچھ تعمیر شروع تھی۔ انھون نے بورڈرون کے رہنے سہنے، اُن کی طرز معاشرت، تعلیم اور اخلاق و تربیت پر نظر کی اور ایک خاص اثر لے کر وہان سے واپس آئے دھلی پہنچکر اسی اثر مین مولانا نے یہ ترکیب بند[۵] نظم کیا۔

ترکیب بند

جھٹ پٹے سے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہین ٹھوکر نہ کھائین — راہ سے آسان گذر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑون سے اور اس لیمپ سے — روشنی محلون کے اندر ہی رہے جن کی سدا
گر نکل کر ایک ذرا محلون سے باہر رکھے تو — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سچ ہے در در پہ یہین وہ حاجت روا اپنا نہین

---

[۵] افسوس ہے کہ یہ ترکیب بند مولانا کے مجموعہ نظم کی جدید اشاعتون مین نہین ہے

روشنی سے جن کی ملاحون کے بیڑے پار ہین

ہم نے ان عالی بناؤن سے کیا اکثر سوال — آشکارا جن سے ان کے بانیون کا ہے جلال
شان و شوکت کی تمہاری دھوم ہے آفاق مین — دور سے آ آ کے تمکو دیکھتے ہین باکمال
قوم کو اس شان و شوکت سے تمہاری کیا ملا — دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال
سرنگون ہوکر وہ سب بولین زبان حال سے — ہو سکا ہم سے نہ کچھ الا انفعال الانفعال

بانیون نے تھا بنایا اس لئے گویا ہمین
ہم کو جب دیکھین خلف اسلاف کو رویا کرین

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ ایک شاندار — اور چھوڑا اس نے ایک ایوان عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ مین اپنے لگائے — ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار
اک محب قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے — قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہوگی عالم مین کہو سر سبز یہ پچھلی مراد؟ — یا وہ اگلون کی امیدین لائینگی کچھ برگ و بار

چشمہ سرچیون ہے جو بہتا رہےگا یہان سدا
سب اُتر جائینگی چڑھ کر ندیان برسات کی

دور سے امید نے جھلکی سی ایک دکھلائی ہے — ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے
قوم کے پیر و جوان سب ہوگئے تھے مردہ دل — دردمندی جوش مین جن اہل دل کو لائی ہے
پاؤگے تاریخ مین ہرگز نہ تم اس کی مثال — سلطنت نے قوم کی جو یہان مدد فرمائی ہے
غیر قومون نے بھی کی ہے شرط ہمدردی ادا — یہ بنا چلتی ہوا تک کو بھی دل سے بھائی ہے

آؤ ہم بھی اے عزیزو مغتنم سمجھیں اسے
اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اسے

یہ مبارک گھر نزولِ خیر و برکت ہے جہان — جسکی پیشانی سے ظاہر ہین سعادت کے نشان
یہ نہالِ تازہ جس کو اک زمینِ شور مین — خرم و سرسبز کرنا چاہتے ہین باغبان
یہ مسیحائی علاج اس دردِ بے درمان کا — لا دوا ٹھیرا چکے جس کو اطبائے زمان
یہ نمونہ اس عزیزِ مصر کا جس نے ستم — جن کے ہاتھون سے سہے دی قحط سے انکو امان

عہد و پیمان اے عزیزو تم سے کچھ لینے کو ہے
قوم کو یہ برکتین بے انتہا دینے کو ہے

آرہی ہے اس مکان کے گوشہ گوشہ سے صدا — قوم اگر سمجھے تو ہون مین قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکسیر دنیا مین تو ہون اکسیر مین — اور اصل کیمیا کچھ ہے تو مین ہون کیمیا
ہاتھ آجاتا سکندر کو اگر میرا سراغ — چھوڑ دیتا جستجوئے چشمۂ آبِ بقا
میرے جو حامی ہین انکی یون پھلینگی کوششین — ایک دانہ سے ہون خوشے جسطرح پیدا نہا

ہے عبث گر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے
برکتین ان پر جنہون نے وقت پر جانا مجھے

ان سے کہدو قوم مین ہین جو کہ عالی خاندان — یا جنہین جاگیر و منصب پہ ہے ناز بیکران
کیا لئے بیٹھے ہو فخرِ منصب و جاگیر کو — منصب و جاگیر ہین سب کوئی دن کے میہمان
تم نہین رتبہ مین بڑھ کر تغلق و تیمور سے — تنگ ہے آج انکی نسلون پر زمین و آسمان

چھوڑ جاؤ واسطے اولاد کے کوئی سپہر — ورنہ وار اپنا کرے گی گردشِ دورِ زمان

آؤ یا نہ ہو عہد مجھ سے اور میرا ساتھ دو

میرا سودا نقد ہے اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو

میں تمہیں پستی سے پہنچاؤنگا تا اوجِ کمال — میں تمہیں دیکھونگا جیسے گر گیا ہو لونگا سنبھال

میں بناؤنگا تمہارے کام سب بگڑے ہوئے — میں سُجھاؤنگا زمانہ کی تمہیں چال ڈھال

جو کرینگے آج میری نصرت و بازو سے مدد — میں سدا کرتا رہونگا ان کی نسلوں کو نہال

قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یاور ہوں میں — لوگ دار الکفر سمجھیں مجھکو یا دار الضلال

میں دکھاؤنگا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے

تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤنگا تمہیں — سلطنت کا معتمد بننا بتاؤنگا تمہیں

قابلیت تم میں پڑھنے کی ہو دیکھوں جسقدر — پڑھ سکوگے جسقدر اتنا پڑھاؤنگا تمہیں

تب یہ سمجھوگے کہ ہم سوتے تھے کیسے بے خبر — دفعتاً جب خوابِ غفلت سے جگاؤنگا تمہیں

یاد ہوگا تمکو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب — پھر مخاطب خیرِ امت کا بناؤنگا تمہیں

مجھکو دیکھو گر میرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ

روزِ روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

بارک اللہ اے ریاضِ علم اے میرے انتخاب — ہے ہمارے بخت و دولت کی نشان تیری بِنا

ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیلِ کاروان — چار سو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات

قوم سے تو بھی یونہیں جہل اور بدعت کو مٹا | جس طرح دین حنیفی سے مٹے لات و منات
چھوڑ جائینگے جو یاں ہیں جو کہ کچھ ہیں بے بقا | چھوڑ جائینگے وہی کچھ باقیات الصالحات

ایک باہمت جماعت جب کہ تیرے ساتھ ہے
ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہاتھ ہے

تو سدا آباد رہ اے قوم کے امیدگاہ | اے یگانوں اور بیگانوں کے یکساں خیرخواہ
دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے | قوم نے اب بھی اگر پہچانا نہ تجھ کو آہ آہ
اپنے حامی آپ پیدا کر کہ ہو سربلند | اپنی تو بھی ہے آپ اپنے لیے پشت و پناہ
خیر کی امید رکھنی ہے عبث اس قوم سے | آپکو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ

چارہ آخر کچھ نہیں حالی بجز صبر و سکون
کر دعا اب اهد قومی انهم لا یعلمون

مولانا کی طبیعت نوکری کے قابل نہ تھی اس لئے وہ ہمیشہ پریشان رہتے تھے مگر جب ۱۸۸۸ء میں نواب سر آسمان جاہ وزیر دولت آصفیہ نے ان کا وظیفہ علمی مقرر کر دیا تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور اگرچہ خانگی تردد و آلام کا سلسلہ موجود تھا اور صحت بھی اکثر و بیشتر خراب رہتی تھی لیکن اب زیادہ وقت تصنیف و تالیف، مطالعہ اور کتب بینی میں گذرتا تھا۔

وہ اکثر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش
ہوتے اور اپنی پُردرد نظموں سے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتے۔
۱۸۹۱ء میں جب انھوں نے علیگڈھ کے اجلاس میں ایک
ترجیع بند سنایا جس میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقرا
اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر دکھایا تھا اور انھیں کے
ساتھ تمام قومی امیدوں کو وابستہ کیا تھا تو اجلاس پر ایک
عجیب عالم طاری ہو گیا تھا کیونکہ شرکاء اجلاس میں یہی
طبقہ بہت زیادہ تھا جس کو مولانا نے خطاب کیا تھا۔

نظم کے ختم ہونے پر سرسید نے بے اختیار اجلاس
کو مخاطب کر کے کہا کہ :-

"اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی ایک
عجیب نظم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی اردو اور عربی میں بھی کسی
شاعر نے نہیں لکھی۔ یہ نظم نصیحت دیتی ہے ان لوگوں کو جن کے
دل اس دنیا کی دولت اور ترقی میں پھنسے رہتے ہیں اور متوسط
درجے کے لوگوں کو ایک نتیجہ بتاتی ہے کہ وہ باتیں جو ان کو نصیب
ہوتی ہیں اعلیٰ سے اعلیٰ دولتمندوں کو بھی نصیب نہیں۔ شاعری جو
ہمیشہ سے ہندوستان میں جاری ہے وہ سب لوگ یقین کرینگے

کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کانوں کو ہوتی ہو مگر دل میں اثر کرنے والی نہیں ہوتی۔ لیکن جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہے ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے اور فخر کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانہ میں جو کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعراء، فخر علماء، اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی،،

وہ اسی سال سرسید کے ہمراہ ڈیپوٹیشن میں حیدرآباد بھی گئے تھے جہاں نواب وقار الامرا کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا اور مولانا شبلی نے اپنی نظمیں جو اس موقع کے لئے لکھی تھیں سنائیں۔ مولانا حالی نے ایک قصیدہ پڑھا تھا جس میں نواب سر آسمان جاہ اور دیگر امرا کی عنایتوں کا شکریہ اور اعلیحضرت کی مدح اور ایڈریس قبول کرنے کے تذکرہ کے بعد اس سفر کا مدعا اور حیدرآباد

سے قومی امیدوں کی وابستگی کا اظہار تھا تو اس وقت ایک
عجیب سماں بندھ گیا تھا۔

نواب وقار الامرا پر خاص اثر ہوا اور انھوں نے "محل فلک نما"
پر مولانا حالی اور مولانا شبلی کو مدعو کر کے پھر دوبارہ یہ نظمیں
سنیں اور اس میں شک نہیں کہ ان نظموں نے وہاں امرا
کو بہت متاثر کیا۔

غرض ان کی طبیعت کے سوز و گداز اور ان کے ہمدردانہ
جذبات اور ان کے فضل و کمال نے قوم کے تمدن و معاشرت
اخلاق و عادات اور لٹریچر پر ایک زبردست اور دیرپا اثر ڈالا
اور جب تک ان میں طاقت رہی مختلف صورتوں میں اپنے
شاعرانہ کمال کو ان ہی مقاصد پر صرف کرتے رہے لیکن اسی
کے ساتھ بذات خاص مالی امدادوں کے لیے بھی کوشش کرتے
رہتے تھے چنانچہ جب ۱۸۹۵ء میں سر سید لاہور گئے ہیں
تو مولانا نے بڑی سرگرمی سے پانی پت اور کرنال میں چندہ جمع
کیا اور واپسی میں سر سید کو پانی پت میں ٹھہرا کر تین ہزار سے
زاید رقم پیش کی۔

سر سید میموریل فنڈ اور یونیورسٹی کی تحریک کو بھی انھوں نے

اپنی نظموں اور کوششوں سے تقویت دی۔

لاہور کے جلسہ کی تقریر جو یونیورسٹی کے رزولیوشن کی تحریک کے متعلق ہے یونیورسٹی کے بنیادی لٹریچر میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

وہ نواب محسن الملک کی خوبیوں کے بڑے قدرشناس تھے اور سر سید کے بعد جو مشکلات رونما ہو گئی تھیں ان کے دور کرنے میں باوجود ناسازی مزاج برابر کام کرتے رہتے تھے۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہو کر قوم میں جوش پیدا کرتے تھے

مولانا کو سررشتہ تعلیم کی ملازمت کی وجہ سے تعلیمی معاملات میں بھی کافی تجربہ تھا اور پھر تعلیمی مجالس کی شرکت اور ان میں تبادلہ خیالات نے ان کو زبردست ماہر تعلیم بنا دیا تھا اس لحاظ سے سنہ ۱۹۰۸ء میں اجلاس کانفرنس منعقدہ کراچی کے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے اس اجلاس میں ایک نہایت شاندار خطبہ صدارت پیش کیا جس کا ابتدائی حصہ جس میں نواب محسن الملک کا تذکرہ تھا بہت دردناک تھا جس کو پڑھتے ہوئے مولانا خود آبدیدہ ہو گئے اور ۳۰ منٹ سے زیادہ نہ پڑھ سکے اور مولوی وحید الدین صاحب سلیم نے پورا کیا اسکے

بعد مولانا نے سندھ کا وہ تعلق جو اسلام اور علوم اسلام کے ساتھ رہا ہے اُسکی علمی رفعت اور پھر موجودہ زبون و خراب حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد اُس کی تعلیمی و تمدنی اصلاحات کی تجاویز بیان کین پھر اُنہون نے یہ دکھا کر کہ عالم اسلامی مین تعلیمی تحریک کس طرح شروع ہے روسی مسلمانون کی تعلیمی جد و جہد اور تعلیمی فیاضیون کا تذکرہ کیا اور دکھایا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہین اس مین گورنمنٹ روس کی اعانت شامل نہین ہے اور ہندوستان مین پست قومون کی اعانت گورنمنٹ فیاضی کے ساتھ کرتی ہے مسلمانون کو اُن کی کوششون سے سبق لینا چاہیئے پھر اُنھون نے صنعت و حرفت پر بحث کی اور فرمایا کہ :-

صاحبو! صنعت و حرفت کی ضرورت ہندوستان مین عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے - جب سے سدیشی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے ہموطن اوس کی طرف اور بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہین - گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات - جن مین وہ اکثر مبتلا ہوتا رہتا ہے اُن سے اس کا نجات پانا محض صنعت و حرفت کی ترقی پر منحصر ہے - ممالک متحدہ مین اسی مقصد کے لئے انڈسٹریل کانفرنس قایم کی گئی ہے اور صوبون مین بھی اس طرف توجہ ہوتی جاتی

ہے۔ اگرچہ مسلمان بھی اس ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور
پر وہ اب تک اُس سے بالکل الگ رہتے ہیں اور نہایت اندیشہ
ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے
سبب اپنے تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب کسی طرح
اُن کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت و حرفت سے بھی
اس وقت ان کی غفلت کا وہی انجام نہ ہو۔ میں صنعت
و حرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی
نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اُسی کو دہراتا ہوں
اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرفت کی طرف
متوجہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر سال ہر درجہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت
و حرفت کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے انکی حیثیت کے موافق معقول وظیفے دیئے
جایا کریں تو امید ہے کہ چند سال میں ایسے کثیر التعداد نوجوان پیدا ہو جائینگے جو اپنے ہم
چشموں کو آزاد پیشہ پر ہاتھ ڈالنے کی جرات دلا سکیں گے اور
اگر قوم کے دولتمندوں کو خدا ایسی توفیق دے کہ وہ اپنے
پاس نوجوانوں کو وقتاً فوقتاً صنعت و حرفت کی تعلیم کے لئے
معقول وظیفے دے کر یورپ یا جاپان بھیجتے رہیں تو امید ہے
کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کے دن پھر جائیں گے ''

اس کے بعد صنعتی وظائف قائم کرنے اور زراعت کے جدید طریقوں کی تعلیم پر توجہ دلائی اور آخر میں فرمایا۔

"بہرحال مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے ہر ایک شعبے میں دستگاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں کہ ان کے ہم وطن ان سے بہت دور آگے نکل گئے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنے بقا اور اپنی ہستی سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک | قومیں وہ چند روز دنیا میں مہمان ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ میں ان کو نگل جاتے | دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتوان ہیں!!
سنبھلو کہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
جیسے اور بہت سے گمنام و بے نشان ہیں

(۴)

مولانا اس فضل و کمال کے ساتھ اخلاق و عادات میں بھی فرد فرید تھے اور ان کے وسیع اخلاق میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا پرتو تھا قرآن و حدیث کے مطالعہ نے ان کی فطرت صحیحہ کو جلا دے دی تھی۔

ان کو کچھ کم چالیس سال محمڈن کالج کے ساتھ تعلق رہا اور اس عرصہ
مین بہت سے دشوار گذار مراحل پیش آئے بہت انقلابات ہوئے
آپس کے تنازعات نے اس کی بنیادون تک کو ہلا دیا۔ لیکن مولانا
نے ایک متولی (ٹرسٹی) کی حیثیت سے نہایت دیانتداری اور
صداقت سے اپنے فرائض تولیت ادا کیے۔

اُن کے دل مین سرسید کا انتہائی احترام تھا، وہ سرسید کے
تمام کامون کو عزت اور محبت کی نظرون سے دیکھا کرتے تھے اور
اپنے خانگی خطوط مین اُن کی بعض صفات کو نمونے اور مثال
کے طور پر عزیزون اور دوستون کو لکھتے تھے۔

لیکن سرسید کی اس عظمت و محبت کے مقابلہ مین اُن کے
دل مین اُس کام کی وقعت و الفت بھی بہت زیادہ تھی جو
سرسید نے کیا تھا اور اسی بنا پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ حالی کے
دستخط نے ۱۸۹۶ء مین نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک
کے ساتھ شریک ہو کر ایک یادداشت پر دستخط کیے جو ٹرسٹیون کے
نام لکھی گئی تھی اور جس کا مطلب یہ تھا کہ "وہ کالج کی خبر لین اور
اُس کو یورپین اشخاص کے ہاتھون مین چلے جانے سے روک لین"
جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ سرسید کو کالج سے بے دخل یا معزول

کر دیا جاوے۔

۱۸۸۹ء میں جب سرسید نے سید محمود کی جانشینی کا مسئلہ پیش کیا ہے تو ان حالات کی بنا پر جو اس وقت تھے مولانا نے سرسید کی حمایت و تائید کی تھی لیکن ۱۹۰۵ء میں جبکہ سید محمود کو کالج سے سبکدوش کرنے میں کالج کی بہتری معلوم ہوئی تو مولانا نے ان کو سبکدوش کرانے میں پورا حصہ لیا۔

آنریبل مسٹر ماریسن سے ان کے نہایت گہرے تعلقات تھے اور ان تعلقات کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے مسٹر ماریسن کے وداعی جلسہ میں پڑھی تھی لیکن جب انھوں نے اپنا جانشین مسٹر آرچبولڈ کو مقرر کرانا چاہا ہے اور اس پر زور دیا ہے اور نواب وقار الملک نے سخت اختلاف کیا ہے تو مولانا نے نواب وقار الملک کا ہی ساتھ دیا اور نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اور ٹرسٹیوں کو بھی ہم رائے بنایا۔

اگرچہ مولانا ٹرسٹی شپ کے فرائض پورے طور پر انجام دیتے تھے اور جو کچھ ان کے امکان میں تھا کالج کی بہبودی کے لئے کرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ٹرسٹیوں کی عام بے توجہی اور کمزوری کو محسوس کرتے تھے اور ۱۹۰۷ء کی شورش طلباء کے تحقیقاتی کمیشن کے

پریسیڈنٹ کو اُنھون نے آزادی کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ نکمے
اور نالایق ٹرسٹیون کی بھرتی جو سید کے زمانہ مین ہوئی تھی
اور ابھی تک وہی اُصول چلا آرہا ہے اس کو ختم ہونا چاہیئے
اور ایسی تدابیر کرنی چاہیئین کہ جن سے موجودہ ٹرسٹیون
کی غفلت اور بے پروائی کا انسداد ہو اور آئندہ کسی عمدہ اور مستحکم
اُصول سے اُن کا انتخاب عمل مین آیا کرے۔

اسی طرح نواب وقارالملک اور مسٹر آرچبولڈ کے جھگڑے مین
جو سکریٹری اور پرنسپل کے اختیارات کے متعلق تھا اور جس مین
ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے بعض مشورے ایسے دیئے تھے جن سے
اتفاق کرنے مین قومی وقار کو صدمہ پہنچتا تھا اور اس کے خلاف
ٹرسٹیون نے رزولیوشن تیار کئے تھے تو مولانا کو اندیشہ لاحق
ہو گیا تھا کہ ربیدار تعلقدار عہدہ داران سرکاری اور ان کے
علاوہ بعض دیگر اصحاب ہز آنر کی ناراضی کے وہمی خیال سے
اختلاف کرین گے اور مخالفین کے غلبہ رائے کی صورت مین
آنریری سکریٹری استعفیٰ دیدین گے دوسری طرف پرنسپل کے
مستعفی ہو جانے اور اس استعفا سے حکام انگریزی کے
دلون پر خراب اثر پڑنے کا بھی اندیشہ تھا مولانا نے ان اندیشون

کو خواجہ سجاد حسین صاحب کے نام ایک خط میں لکھ کر اپنی رائے اس طرح ظاہر کی کہ:-

”لیکن پہلا اندیشہ دوسرے اندیشہ سے میرے نزدیک زیادہ سخت ہے کیونکہ ہز آنر کے وہ مشورے مان لئے گئے جن کے قبول کرنے سے عذر کیا گیا ہے تو سکریٹری بلکہ تمام ٹرسٹیوں کا عدم وجود برابر ہو جائیگا اور محمڈن کالج بمنزلہ گورنمنٹ کالج کے ہو جائے گا“

غرض مولانا نے اس فرض کو ہر موقع پر کامل خلوص اور دیانت سے انجام دینے میں کسی دوست یا عزیز حتیٰ کہ خود سر سید مرحوم کی بھی پروا نہیں کی۔

اُن کا دل درد سے بھرا ہوا تھا جو نہ صرف نظموں میں نمایاں تھا بلکہ اُن کی روزمرّہ کی زندگی اور اُن کے تمام تعلقات میں ظہور پذیر تھا۔ وہ اپنے خانگی خطوط میں اپنے بیٹیوں اور عزیزوں کو بھی لوگوں کے ساتھ بھلائی اور ہمدردی کرنے کی نصیحت کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر کسی عزیز کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے

برابر یقین سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ
اور پھر تمام ابناء جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سلوک
اور بھلائی کی جائے۔"

اسی طرح ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ "ایک ہمسایہ
کی تکلیف دوسرے ہمسایہ کے لئے سوہان روح ہوتی ہے۔"

وہ طلبا کی امداد بھی حتی الوسع اپنے پاس سے کرتے رہتے
تھے اور جو عزیز یا دوست اس قابل ہوتے کہ ان سے مدد دلوائی
جائے تو ان کو بھی سفارش کے خطوط لکھتے۔ وہ اپنے اعزا کی
دنیاوی ترقیوں سے ہی خوش ہونے والے نہیں تھے بلکہ ان کی
اخلاقی ترقی کے بھی آرزومند تھے اور یہی وجہ تھی کہ روزمرہ کے
خطوط میں بھی وہ عزیزوں کو مختلف پیرایوں میں دلپذیر نصائح
کرتے رہتے تھے۔

ان کے بھتیجے خواجہ تصدق حسین صاحب مرحوم ان کی سفارش
اور کوشش سے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری پر مامور ہوتے ہیں
اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولانا اس کے جواب
میں لکھتے ہیں کہ

"جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادتمندی

اور کسی قدر تمھاری نادانی کی دلیل ہین
اگر بفرض محال میری کوشش کو تمھاری
کامیابی مین کچھ دخل ہوا ہی تو اس کو تقریباً
ایسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو
بیٹے کی کامیابی مین ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہین
ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہیگا
تعجب کی وہ باتین ہین جو آج کل لوگ دنیا مین کر رہے ہین
جو غیرون کے بچون کو تعلیم دلواتے ہین اپنی بساط سے زیادہ ان کی
امداد کرتے ہین تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوششین کرتے ہین
جیسے کسی خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے اپنی جان
اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے قوم کی طرف سے
ان پر گالیان پڑتی ہین مگر وہ قوم کا خیال نہین چھوڑتے اور رات دن اسی دھن
مین لگے ہوئے ہین یہ لوگ ہین جن کا ہم کو اور تمام قوم کو دل و جان
سے شکر ادا کرنا چاہیئے اور انہین کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم مین
کسی قدر آپس کی ہمدردیون کا خیال پیدا ہو گیا ہے !!

وہ فراخ حوصلہ اور قدرشناس تھے مصنفین کی حوصلہ افزائی کرتے
اون کی کتابون کو خرید کر دلچسپی سے پڑھتے اور بعض اوقات مستعد ہو

خرید کر لائبریرون مین بھیجدیتے تھے۔ مولوی عبدالرزاق صاحب سے بر سبیل تذکرہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ جس کتاب کی قیمت ادا کی جاتی ہے اُس کے مطالعہ مین بھی زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ نوجوانون کو علمی کامون کا شوق دلاتے مولوی عبدالرحیم صاحب مرحوم بیدل کے ایک خط مین لکھتے ہین کہ :-

"عزیزی خواجہ عبدالمجید خان صاحب کو بہت بہت دعا کہئیے۔ امید ہے کہ اب اُن کے بچے سب بخیریت ہون گے معلوم نہین کہ اُنھون نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہین؟ اُن کو خدا تعالی نے ایسی لیاقت دی ہے کہ ملک اور قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہین اور چونکہ عنایت الہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہین ہے اس لئیے ان کے علمی مشغلون مین کوئی چیز مزاحم نہین ہو سکتی میرے نزدیک صرف کتابون اور اخبارون کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدردانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگان کھونا ہے اس موقع پر مین اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہون اور چاہتا ہون کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھین اور اگر وہ درحقیقت سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہین تو اس رباعی پر عمل کرین ؎

یارو نہین وقت عیش و آرام کا یہ موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ

بس حُبِّ وطن کا جپ جپنا ہے ۔ ایسا کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

اُنھون نے جو خطوط مولوی عبدالحق صاحب بی اے کو لکھے ہین اُن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قابل نوجوانون کو کسطرح اُبھارتے تھے اور اُن کے کامون کی کیسی قدر کرتے تھے اسی سلسلہ مین اُن سے ایک کتاب "خاتونانِ ہند"[1] پر ریویو کرنے کی فرمایش کرتے ہین اور اس کا مقصد یہ بتاتے ہین کہ

"ریویو لکھوانے سے مقصود یہ ہے کہ مولفہ کتاب جو برہمو ہے اس کو شرمایا جائے کہ با وجود برہمو ہونے اور دعوے بے تعصبی کے ایک ایسی کتاب جو عورتون کے لیے لکھی گئی ہو اور جس کا مقصد ہندوستان کی عورتون کے خیالات کی اصلاح ہو ایسے متعصبانہ خیالات ظاہر کرنے اور وہ بھی محض بے اصل اور تاریخ کے خلاف ایک برہمو سماج کے ممبر سے نہایت بعید اور قابل افسوس ہے"

اور ان کو اس بنا پر انتخاب کرتے ہین ۔

"چونکہ آپ نے عالمگیر کی لائف کو ایک مصنف کی نظر سے مطالعہ

---

[1] یہ کتاب ایک ہندو مصنفہ نے جو برہمو سماج کی ممبر تھی تالیف کی تھی جسکی نسبت مولانا کو پہلے یہ حسن ظن تھا کہ وہ غیر متعصب ہے لیکن اس کتاب کو جسمین اُس نے عالمگیر کی نسبت انتہائی تعصب کا اظہار کیا تھا دیکھ کر یہ اُن کا حسن ظن جاتا رہا ۔

کلیلہے اس لئے مین سمجھتا ہون کہ آپ بہت آسانی سے موئف مذکور کی قلعی کھول سکین گے مگر ریویو کی طرز بیان بہت شایستہ اور الفاظ نہایت سنجیدہ ہونے چاہئین جن سے برہم سماج کے تمام ممبر متاثر اور شرمندہ ہون - یہ سماج برخلاف آریہ سماج کے نہایت آزاد اور صلح پسند ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ کے ریویو کا ان لوگون پر عمدہ اثر ہوگا - ریویو مین اس بات پر زیادہ زور دینا چاہیئے کہ جو لوگ ہندو مسلمانون مین تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابین لکھتے ہین وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہین خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان برہمو ہون یا آریا "

اور جب ریویو لکھکر دلگداز مین شایع کراتے ہین تو مولانا کس خوشی کے ساتھ ارقام فرماتے ہین کہ -

" دلگداز مین خاتونان ہند پر آپ کا ریویو دیکھ کر بہت ہی جی خوش ہوا اور اسی خوشی مین دلگداز کی خریداری کی درخواست آج بھیجدی ہے یہ بھی لکھہ بھیجا ہے کہ ایک کاپی اس نمبر کی مصنف خاتونان ہند کے نام لاہور ضرور بھیجدین اس کی قیمت مین خود دونگا "

ایک اور خط مین ان کی ایک کتاب زیر تالیف کی نسبت لکھتے ہین کہ " اسلامی حکومت مین ہندو مسلمانون کے تعلقات پر جو کتاب آپ لکھ

رہے ہیں خدا کرے وہ میری زندگی میں پوری ہو جائے۔ مجھے اس کے دیکھنے کا نہایت اشتیاق[۵] ہے"

مولانا کی صحت تو عرصہ سے خراب ہو چکی تھی، ۱۹۱۰ء میں بصارت پر بھی اثر پڑ گیا تھا اور دماغ بھی کمزور ہو گیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی علمی کام ضرور کرتے رہتے تھے ۱۹۱۲ء میں بہت ضعیف ہو گئے تھے اور اب بغیر کسی مددگار کے کام کرنا مشکل تھا ایک عزیز کو نہایت اصرار کے ساتھ لکھا کہ وہ آجائیں تو ان کی امداد سے کچھ کام کریں اس خط میں یہ حسرت انگیز فقرہ بھی تھا کہ" اب چل چلاؤ کے دن قریب ہیں ایک ایک گھڑی نہایت قیمتی ہے"

ان کا مطالعہ اخیر وقت تک جاری رہا اور جب نظر کمزور ہو گئی تو اخبارات اور کتابیں پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

علی گڑھ سے ان کو ایک خاص اُنس تھا اور اس زمانہ میں بعض اسباب سے ان کا خیال ہو گیا تھا کہ وہیں مستقل قیام کریں اور اس ارادہ کی ایک دوست کو اطلاع بھی دی تھی۔

---

[۵] افسوس کہ مولوی عبدالحق صاحب کی مصروفیتوں نے اس اشتیاق کو پورا نہیں ہونے دیا اور شاید بہت سے مشتاق اسی اشتیاق کو قبر میں ساتھ لے جائیں۔

"میں بھی مدت سے ارادہ کر رہا ہوں کہ علیگڈھ میں بقیہ زندگی بسر کروں اگرچہ میں سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہا اور تخلیہ اور تنہائی کو زیادہ پسند کرتا ہوں اور کسی مفید کام کرنے کی بھی اب قابلیت نہیں رہی لیکن اس شغل سے بالطبع موانست ہے"

سید ہاشمی صاحب فریدآبادی نے جن کو مولنا کے ساتھ بہت گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے اپنے ایک مضمون میں مولینا کے اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ

مولوی حالی مرحوم کی زندگی شرافت و صداقت، حلم و انکسا صبر و سادگی کا قابل دید نمونہ تھی۔ اُن کے اخلاق شائستہ کا پاس بیٹھنے والوں پر پرتو پڑتا تھا۔ بزرگوں نے لکھا ہے اور میں نے ان کی صحبت میں آزمایا۔ کہ نیکوں کے محض حضور میں بڑے سے بڑے دل صلاح و نکوئی قبول کرتے ہیں۔ مدت العمر کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے کبھی اپنی زبان کو غیبت و بدگوئی سے آلودہ نہیں کیا۔ اور مجھے یہ سبق پہلی مرتبہ اُن کی دلچسپ مجلس میں حاصل ہوا کہ اتنے وسیع تعلقات اور واقفیت کے باوجود بھی آدمی چاہے تو اپنی ہمہ رنگ و ہمہ گیر گفتگو کو لوگوں کی ہجو بیجا اور مذمت ذات سے خالی

رکھ سکتا ہے اگر مرحوم کے فضل و شرف کی اس سے بھی زیادہ نمایاں دلیل ہو وہ صرف یہ تھا کہ وہ جس قدر ہمدرد و با مہر تھے اسی قدر فراخ حوصلہ اور قدر شناس تھے۔ مسلمانوں کی بگڑی ہوئی قوم میں ایسے افراد کم ملیں گے جو اپنی ذہانت اور وسعت نظر سے نکتہ چینی کی بجائے قدردانی اور ہمت افزائی کا کام لیں۔ عیب جوئی اور تنگ دلی ہمارے اخلاق کی پستی اور قومی انحطاط کا نتیجہ اور آیندہ ترقی کے حق میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اسی لئے شاید ہمیں کام کرنے والوں سے بھی زیادہ کام کی قدر جاننے والوں کی ضرورت ہے۔

مولوی حالی مرحوم کی معاشرت بالکل سادہ اور طالب علمانہ تھی ان کے مشاغل خیالات گفتگو بالکل پاک صاف اور نہایت مہذب ہوتی تھی اور کبھی کوئی رکیک بات یا کلمہ ہزل اُن کی زبان پر نہ آتا تھا۔"

مولانا کی اخیر حالت کا اندازہ اور اُن کی مہمان نوازی وغیرہ کی کیفیت مولوی عبدالرزاق صاحب کے اس بیان سے معلوم ہو گی کہ

سنہ ۱۹۱۲ء میں میری اور خواجہ صاحب کی اخیر ملاقات ہوئی میں خواجہ صاحب

کا تین دن مہمان رہا انتہا درجہ کے مہمان نواز تھے دونون وقت دسترخوان پر فصلی میوے اور پانی پت کی مشہور دکان کی بالائی ہوتی تھی - اس زمانہ مین خاموش ہو گئے تھے - باتین بہت کم کرتے تھے - مین نے پوچھا اب شاعری کا کیا حال ہے تو ہنس کر فرمایا ع "نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی" پھر فرمایا حافظہ کا یہ حال ہے کہ بعض اوقات لغات کے معنی سوچا کرتا ہون اور یاد نہین آتے ہان اگر اچھا مضمون ہاتھ آگیا تو اسکو رباعی مین ادا کر دیتا ہون - ضعف بڑھ گیا تھا بلا ضرورت بالاخانہ سے نیچے نہین اُترتے تھے -

سنہ ۱۹۱۳ء مین خواجہ صاحب سے جو مراسلت ہوئی اُسکے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ انحطاط کا تھا -

۱۵ فروری سنہ ۱۹۱۳ء کے ایک خط مین تحریر فرماتے ہین کہ "وہ نظام الملک طوسی جیسی عالی درجہ تصنیف پر ریویو لکھنے کے قابل اب مین نہین رہا قطع نظر اس کے کہ قوائے جسمانی روز بروز مضمحل ہوتے چلے جاتے ہین دماغ بھی معطل بلکہ مختل ہو گیا ہے - خطون کا جواب مستثنیٰ حالتون کے سوا ہمیشہ دوسرون سے لکھواتا ہون جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب

فراموش ہو گیا ہے۔ میری موجودہ حالت پر میرزا غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دیگر از خویشتم نبود تکلف بر طرف
این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

بجائے غالب کے آپ کو حالی پڑھنا چاہیئے ''

غرض جس شخص کو جس قدر مولانا سے زیادہ تعلق رہا ہے وہ ہی اُن کی خوبیوں کا زیادہ معترف نظر آتا ہے بعض ایسے قابل افراد بھی ہیں جن کی نظر دلوں کے عیوب کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور ایک ذرا سی معمولی بات میں بھی برائی کا بہت بڑا پہلو نظر آتا ہے مگر مولانا کے وسعت اخلاق اور شرافت نفس کا بغیر کسی نکتہ چینی کے وہ بھی اعتراف کرتے ہیں

۱۹۱۱ء سے عالم اسلام پر جن مصائب کا پہاڑ ٹوٹا ، طرابلس اور بلقان میں جس طرح مسلمانوں پر تباہی آئی اور کامل چھ برس تک بربادی کا جو خوفناک منظر سامنے رہا وہ اس صدی کا ایک ایسا دل دوز اور جگر سوز واقعہ ہے جو مسلمانوں کو صدیوں خون رلائے گا۔ ان حالات میں ناممکن تھا کہ مولانا حالی کا دل جو عمر بھر ایک ایک مسلمان خاندان کی تباہی و بربادی پر روتا رہا ہو بیتاب

و مضطرب ہو جاتا وہ روزانہ جنگ کی خبریں سنتے اور بے قرار ہو جاتے اور دل کا درد آنکھوں سے قطرات اشک بن کر ٹپکتا۔ کئی مرتبہ زبان سے اس مظلومانہ آرزو کا بھی اظہار ہوا کہ "الٰہی وہ وقت بھی کبھی آئے گا جبکہ ترک اور ایرانی کے قتل و خون کے بجائے ہم یہ سنیں گے کہ آج اتنے جرمن مارے گئے اور اتنے روسی کام آئے"

ایک خانگی خط میں لکھتے ہیں کہ :-

"ٹرکی کی خبریں جو آجکل آرہی ہیں انہوں نے بالکل کمر توڑ دی ہے ایران اور مراکو کی تو فاتحہ خیر پڑھ چکے تھے اب ٹرکی کی بھی بظاہر خیر نہیں معلوم ہوتی ہے لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا"

ان کا دل ہر اس شخص کی محبت سے معمور ہو جاتا جو ان مظلوموں کی ہمدردی و اعانت میں کوئی آواز بلند کرتا یا کوئی عملی تحریک لے کر سامنے آتا ان ہی جذبات سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان کی ان کوششوں کی نسبت جو انھوں نے طرابلس و بلقان کے شہیدوں اور مجروحوں کی ہمدردی میں کی تھیں مولانا نے "شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان" کے عنوان سے یہ مخصوص نظم لکھی تھی۔

شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان

اے مالکِ دفترِ زمیندار — اے نازشِ قوم و فخرِ اقران
اے روحِ روانِ جمیع احباب — اے چشم و چراغِ بزمِ اخوان
اے دین کے امتحاں میں جانباز — اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر — اے شیر دل، اے ظفر علیخاں
قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جو گن — جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری — قائم کوئی ہو سکی نہ برہان
ہر وقت کی تاک میں برابر — ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ — اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردیِ اہلِ دینِ احمد — جوہر ترے کر دئے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر — دامن ہوا چاک تا گریباں
پھیلے وہ بشکلِ سیلِ آتش — دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غل — جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس — چلنے لگیں ان دلوں پہ چھریاں
وہ بن گئے آپ اپنے رہزن — جو مال کے اپنے تھے نگہباں۔

اسلام کی سمجھے اب حقیقت | جو نام کے تھے فقط مسلمان
ہان اس مین نہین مبالغہ کچھ | سنتا ہی ہے اے ظفر علیخان
نازان ہے وہ درسگاہ تجھ پر | تعلیم پہ جس کی تو ہے نازان
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند | جو قوم کے درد کے ہون درمان
سوز غم دین حق سے جن کے | سینے ہون کباب دل ہون بریان
جو ملک و وطن کے ہون فدائی | جو قوم کے نام پر ہون قربان
مشرق مین ہون درد لیے جو جین | مغرب مین سین جو رنج اخوان
پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر | ہے اس کو یہ فخر و ناز شایان

زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت
ہون زندہ دل ایسے جس مین انسان

اسی طرح مولانا محمد علی کی اُن کوششون کی جو اُنھون نے جنگ بلقان کے زمانہ مین طبی وفد بھیجنے مین کی تھین مولانا حالی کے دل مین بڑی قدر و منزلت تھی جس کا اظہار اُنھون نے اخبار ہمدرد کے اجرا کے موقع پر اس طرح کیا تھا۔

تمغون کی ہوس نہ یان خطابون کی طلب | اک ملک کی خدمت کا ہی سودا یارب
ہمدرد کو اسم با مسمےٰ کیجو | اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب

(۵)

مولانا کی تصانیف ومضامین، شاعری اور عام قابلیت پر تبصرہ کرنا درحقیقت ایک ایسے قابل آدمی کا کام ہے جو مولانا ہی کا ہم پلہ ہو اور مولف تذکرہ ایسی قابلیت سے محض عاری ہے البتہ تذکرہ کی تکمیل کے لیے ان کا ایک مختصر بیان ضروری ہے اور اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔

سلسلۂ نظم مین مولانا کے مسدس مد وجزر اسلام کے علاوہ بہت سی نظمین اور مسدس۔ ترجیع بند، رباعیان، اور قطعات وغیرہ کی شکل مین ہین۔ جن کی الگ الگ اور مجموعہ کے طور پر بکثرت اشاعت ہوئی ہے ان نظمون مین، برکھارت، نشاطِ امید، حب وطن، مناظرۂ رحم وانصاف، مناجاتِ بیوہ شکوۂ ہند۔ حقوقِ اولاد، مستقل مثنویان ہین جو حسن بیان خوبیٔ معانی اور جذبات سے لبریز ہین لیکن اس سلسلہ مین مناجات بیوہ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اور اس مین جو درد بھرا ہوا ہے یہی نہین کہ اُس کا اندازہ سب سے زیادہ بدنصیب بیواؤن کو ہو یا وہ لوگ جنھون نے بیوگی کی مصیبت کو غور سے دیکھا ہے اس درد کا کچھ اندازہ کرین بلکہ ہر پڑھنے والے کا قلب

اس درد سے بےچین ہوجاتا ہے اور خاص کر صغر سنی کی شادی کے ہولناک نتائج جو اس مین نمایان ہین بے حد موثر ہین اور وہ اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ علاوہ دس زبانون کے اعلی سنسکرت مین بھی ہوگیا ہے ۔

مولانا کو تعلیم نسوان کے ساتھ خاص دلچسپی تھی اور عورتون کی اس زار حالت سے جو موجودہ سوسائٹی مین تھی ان کے دل کو تکلیف پہنچتی تھی یہی درد اور تکلیف تھی کہ جس کے اثر سے مولانا نے وہ مشہور نظم جو "چپ کی داد" کے نام سے معروف ہے لکھی۔

اس نظم کے علاوہ ان خیالات وحالات سے جو لڑکیون کی نسبت ناتے اور شادی بیاہ مین بر کی تلاش وانتخاب مین پیش آتے ہین متاثر ہوکر انھون نے ایک اور مختصر نظم بھی لکھی تھی جو ان کے دردِ دل کو ظاہر کرتی ہے ۔

سنہ ۱۸۹۰ء مین خود مولانا نے مجموعۂ نظم حالی کے نام سے ایک مجموعہ شایع کیا جس مین متذکرہ بالا قسم کی نظمون میں سے ۴ نظمین ہین پھر اس اڈیشن کو سنہ ۱۹۰۳ء مین مولانا وحیدالدین سلیم نے بعد کی کہی ہوئی نظمون کا اضافہ کرکے پانی پت سے

شایع کیا۔

مولانا کی قدیم وجدید غزلیات کا مجموعہ بھی "دیوان حالی" کے
نام سے ۱۹۳۰ء میں شایع ہوگیا ہے اور اس مین شعر وشاعری
پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت
رکھتا ہے یہ مقدمہ برسون کی چھان بین، کد وکاوش اور غور و
مطالعہ کا نتیجہ ہے مقدمہ کے بعد پہلے کچھ قطعات ہین جو پند و
موعظت اور وعظ ونصیحت سے معمور ہین، پھر جدید قدیم غزلیات
ہین اور پھر تنوکے قریب حکیمانہ رباعیات ہین، اخیر مین قصائد،
مسدس، ترکیب بند، مرثیے، اور کچھ قطعات اور تاریخین ہین
اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۸ء مین حالی بک ڈپو نے پانی پت
سے اور الناظر بک ایجنسی نے لکھنؤ سے شایع کیا حالی بک ڈپو
نے رباعیات کا مجموعہ اور متفرق نظمون کو جواہرات حالی کے
نام سے الگ الگ بھی شایع کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان
مجموعون مین پھر بھی بہت سی دلچسپ اور مفید نظمین نہین ہین
اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مکمل مجموعہ آب وتاب کے
ساتھ شایع کیا جائے۔ بعض نظمین ایسی بھی ہین کہ جن کا حق تصنیف
مولانا نے کسی قومی انسٹی ٹیوشن کو دیدیا ہے اُن کا حق محفوظ

رہنا چاہیئے کیونکہ وہ ایک خیر جاریہ ہے لیکن اگر کل مجموعہ شایع کیاجائے تو ان النسخی ٹیوشنون کو اس مین حصہ رسدی شریک ہونا چاہیئے۔

مولانا کے مدحیہ قصائد مین بھی ایک خاص رنگ ہی بے سروپا مدح سرائی اور بطحی سے ان کو سخت نفرت ہوگئی تھی وہ اعلے حضرت نظام الملک آصفجاہ سادس مرحوم و مغفور کے جشن جوبلی مین قصیدہ پیش کرنے کی تیاری کرتے ہین لیکن اپنے دوستون سے واقعات طلب کرتے ہین اور چاہتے ہین کہ جو مدح ہو وہ واقعات پر مبنی ہو۔

اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ جب مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوئے ہین تو مولانا نے بھی قصیدہ تہنیت پیش کیا ہے لیکن اسوقت تک ایسے اہم واقعات بھی نہ تھے کہ مولانا کی مدح سرائی ان پر مبنی ہوتی لیکن چونکہ وہ تو تلامیذ الرحمن کے زمرہ مین شامل تھے اسلیئے ان کے اس قصیدہ مین بھی ایک عجیب طرز اور رنگ ہے جسکی مثال متقدمین شعرا کے کلام مین نہین ملسکتی مثالاً اشعار ذیل ملاحظہ ہون

فلک مرتبت میر عثمان علی خان ۔۔۔ مبارک تمھین مسند شہریاری

مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل ۔۔۔ جہان چپہ چپہ پہ ہے ذمہ داری

مبارک بزرگون کی میراث تم کو — جنھون نے کہ جھیلین ہین کڑیان ساری
اب اُن کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا — خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہین دنیا ہو اُن کو سہارا — جو بے یار ہین اُن کی کرنی ہے یاری
نکمّے جو ہین اُن کو کامی بنانا — بڑھانا دل ان کا جو ہین کار و باری
جگانا انھین نیند کے ہین جو ماتے — پڑھانا انھین علم سے جو ہین عاری

مولانا نے نعت مین بھی چند غزلین رباعیان اور قصیدے لکھے ہین لیکن ان مین بھی ایک خاص طرز اور ایک ایسا رنگ ہے جو حالی کے لیے ہی مخصوص تھا۔

مولانا کی رباعیان جو جذبات اور حکمت و موعظت کے سرچشمے ہین نہ صرف ہندوستان مین مقبول ہوئین بلکہ ان کو ایک قابل انگریز مسٹر وارڈ نے انگریزی مین ترجمہ کر کے یورپ مین شایع کیا اور وہان انھون نے قبولیت حاصل کی۔

مولانا کے فیوض و برکات سے نادان چھوٹے بچے بھی محروم نہین رہے اور ان کی سمجھ کے مطابق ان کے جذبات ابھارنے کے لیے متعدد نظمین لکھین۔

مولانا کی بعض نظمین مخصوص قومی انسٹی ٹیوشنون کے لیے ہوتی تھین اور بعض کا حق تصنیف کسی انسٹی ٹیوشن کو مرحمت

کر دیتے تھے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ساتھ اُن کو خاص دلچسپی تھی اور بانیٔ مدرسہ کی بے لوث خدمات کے بڑے معترف تھے۔ وہ محمدن کالج کے بعد تمام اسلامی مدارس میں سب سے زیادہ اسی اسکول کو مسلمانوں کے لئے مفید خیال کرتے تھے اور اُن کی رائے تھی کہ کم استطاعت مسلمانوں کے بچوں کے لیے اس اسکول سے بہتر کوئی دوسرا اسکول نہیں کیونکہ جو فوائد محمدن کالجیٹ اسکول علیگڈھ میں امرا کے بچے حاصل کر سکتے ہیں وہ سب خوبیاں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں کم استطاعت شریف مسلمانوں کے بچوں کے لیے موجود ہیں چنانچہ جب اس اسکول کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس قایم کیا گیا ہے جس میں ابتداءً دس پندرہ بچوں سے زیادہ بورڈر نہ تھے تو مولانا نے اپنے پوتے کو اسی اسکول میں تعلیم کی غرض سے بھیجا تھا۔

مولانا نے مدرسہ کی امداد کے لیے ۱۹۰۳ء کی دہلی کانفرنس کی مشہور نظم "تحفۃ الاخوان" کا حق تصنیف مرحمت فرمایا جس کو منشی رحمت اللہ رعد مرحوم مالک نامی پریس کانپور نے

۳۲۷۰۹

نفاست کے ساتھ طبع کرکے شائع کیا۔ اس کے بعد دوسری نظم کا حق بھی جس کا نام "ترقی و تنزل" ہے عطا کیا۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی مولانا کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ "تہذیب الاخلاق" کے بلند پایہ مضمون نگار تھے اس کے علاوہ متفرق طور پر بھی کبھی کبھی مضامین[۱۵] لکھتے رہتے تھے۔ تصانیف پر ان کا طرز تبصرہ، ریویو نگاری کا ایک نمونہ تھا انھوں نے متعدد کتابوں پر ریویو لکھے ہیں اور ان سے مولانا کے علم و فضل اور وسیع النظری کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

نثر میں ان کی پہلی مستقل کتاب "تریاق مسموم" مذہبی مناظرہ میں ہے یہ کتاب ایک خاص اثر میں لکھی گئی ہے مولانا کے وطن میں ایک قابل آدمی عماد الدین اور ان کے بیٹے عیسائی ہو گئے تھے مگر پھر انھوں نے اور ان کے ایک بیٹے نے اسلام اختیار کر لیا لیکن ایک بیٹا عماد الدین بدستور عیسائی رہا یہ عربی بھی جانتا تھا اور مشن میں ملازم ہو گیا تھا اس نے ایک کتاب "ہدایۃ المسلمین" کے نام سے

---

[۱۵] یہ کل مضامین مولانا سید وحید الدین سلیم نے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرائے تھے۔ لیکن اب نایاب ہیں۔

لکھی تھی اور اس کے جواب مین مولانا نے یہ کتاب لکھی۔

اسی طرح پادری مزکر کی کتاب "تاریخ محمدی" پر ایک تبصرہ رسالہ کی صورت مین لکھا ہے اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جو کچھ پادریون نے لکھا ہے اُس کا فلسفی اور غیر متعصب یورپین کی راؤن سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

اسی ابتدائی زمانہ مین ایک کتاب کا جو فرانسیسی سے عربی مین ترجمہ کی گئی ہے اور طبقات الارض پر تھی عربی سے اُردو مین ترجمہ کیا تھا اور گویا انھون نے اس طرح اُردو زبان کو ایک علمی زبان بنانے مین اس وقت سعی کی جب کہ ترقی اُردو کے خیال کا دماغون مین پتہ تک نہ تھا۔

مولانا کو تعلیم نسوان کے ساتھ اس وقت سے پہلے ہی دلچسپی تھی جبکہ ہمارے مصلحین قوم اس موضوع پر بحث کر رہے تھے اور اس دلچسپی کا عملی ثبوت انھون نے اس طرح دیا کہ عورتون کے پڑھنے کے لیے ایک کتاب "مجالس النساء" تصنیف کی جو کچھ عرصہ تک پنجاب کے مدارس مین داخل نصاب رہی اور خانگی تعلیم مین اس سے فائدہ حاصل کیا گیا اور دہلی کے متعدد خاندانون مین یہی کتاب تعلیم نسوان کا سبب ہوئی اس کتاب کے صلہ مین تعلیمی

دربار دہلی کے موقع پر مولانا کو چار سو روپیہ کا انعام بھی گورنمنٹ کی جانب سے لارڈ نارتھ بروک نے عطا کیا۔

۱۸۸۶ء میں "حیات سعدی" لکھ کر جدید قسم کی سوانح عمریوں کی بنیاد مشرقی ادب میں ڈالی اور ۱۸۹۷ء میں یادگار غالب شائع کی جو مرزا غالب کی نہایت دلچسپ سوانح عمری اور ان کے کلام کی تنقید ہے۔

اردو نثر میں ان کی آخری تصنیف "حیات جاوید" ہے جس کی ابتدا ۱۸۹۳ء میں سرسید کی زندگی میں کی تھی اور چھ برس میں باوجود متعدد مرتبہ بیماریوں میں مبتلا ہونے کے اس کو ختم کیا اور نہایت آب و تاب کے ساتھ منشی رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کانپور میں طبع کرایا۔

سرسید کی قومی خدمات اور احسانات کا اقتضا تو یہ تھا کہ ہر طرف سے اور ہر طرح سے ان کی لائف لکھنے میں مولانا کو مدد ملتی لیکن کسی متنفس نے قلم سے یا درم سے مولانا کو براہ راست مدد نہیں دی۔ کسی زندہ شخص کی یا ایسے شخص کی جس کو انتقال کئے ہوئے بہت قریب عرصہ گذرا ہو اور جس کی شاندار زندگی بہت طویل و عریض ہو، وہ ادیب و مصنف ہو اور ساتھ ہی زبردست

اسپیکر، تمدن و معاشرت اور مذہب کا مصلح اور مجدد ہو، ملکی سیاسیات میں ایک مدبر کا مرتبہ رکھتا ہو۔ غرض اسکی مختلف النوع حیثیتیں ہوں اسکی ذات اور اُس کے کاموں کے متعلق مخالف و موافق رائیں رکھنے والے بھی موجود ہوں اُس کے کاموں کا سلسلہ ہندوستان سے انگلستان تک وسیع ہو۔ ایسی صورت میں اُسکی لائف کا مواد جمع کرنا، پھر اُسکی ترتیب اور اُس کو لکھنا ایک زہرہ گداز کام تھا مگر مولانا نے تنہا اس مہم کو سر کیا اور اس طرح کہ اُردو ادب میں ایک ایسی چیز کا اضافہ کیا جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں جو ۳۰۰ صفحہ کا ہے۔ سرسید کے حالات زندگی ہیں دوسرے حصہ میں جو ۲۵۸ صفحہ کا ہے سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو کیا ہے اور یہ حصہ حقیقت میں مولانا کی محنت و دماغ سوزی کا تماشا گاہ ہے بقول مولانا حبیب الرحمان خان صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر)

"اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مولف نے نہایت غور اور فکر کے ساتھ سرسید کے ہر ایک کام کو خواہ علمی ہو

یا علی دیکھا ہے اُن کی تصانیف کے ہزارون صفحے پڑھ کر اُن کے مضامین کے ماسٹر بنے ہین اور اس کے بعد پوری کاوش سے ان پر سارھے پانچسو صفحون مین اس طرح ریویو کیا ہے کہ اس کے مطالب بالاجمال محاسن با لتفصیل ناظرین کے سامنے آشکارا کر دیے ہین۔

قصہ مختصر سرسید کی ساٹھ برس کی جانفشانیون کے کارنامے صفحات کاغذ پر یون نمایان کر دیے ہین جیسے ایک تیز دست مصور میلون مین پھیلے ہوئے معرکہ کی تصویر چند انچہ کاغذ پر مشاہدہ کرا دیتا ہے۔"

مولانا نے سرسید کے اہم مضامین کو بھی ایک مجموعہ کی شکل مین طبع کرانا چاہا تھا اور اُس کی تدوین بھی شروع کر دی تھی لیکن سرسید نے اصرار کے ساتھ منع کر دیا اور مولانا نے مجبور ہو کر اس ارادہ کو ترک کیا۔

انھون نے نواب مصطفےٰ خان صاحب شیفتہ کے فارسی دیوان کا مجموعہ مرتب کر کے طبع کرایا۔ اور اُس پر ایک دلچسپ دیباچہ لکھا اور اس طرح اپنے استاد کا حق ادا کیا۔ مولانا کے خطوط کا مجموعہ بھی دو حصون مین حالی بک ڈپو نے شایع کیا ہے جو نہایت

دلچسپ ہے اور اگر غور کیا جائے تو ایسا ہی مجموعہ اصلی لائف اور اصلی سیرت ہوتی ہے

چونکہ مولانا کو فارسی سے فطری مناسبت تھی اور غدر سے پہلے تک دہلی مین جو علمی صحبتین تھین اُن کا بھی یہی مذاق تھا اس لیے مولانا کا مذاق فارسی مین بہت اعلےٰ وارفع ہو گیا تھا۔ ایک زمانہ مین مختلف اُردو کتابون کے بعض مضامین کا جو انگریزی سے ترجمہ ہوئے تھے انہون نے فارسی مین ترجمہ کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی عزیز یا دوست کو فارسی مین خط بھی لکھتے تھے۔ انھون نے فارسی مین حکیم ناصر خسرو کی سوانح عمری لکھی ہے

ف ناصر خسرو کے مختصر حالات فارسی تذکرون مین موجود تھے۔ لیکن اس کی مفصل سوانح عمری یکجا نہ تھی مولانا نے نہایت کاوش اور تحقیقات سے مکمل سوانح لکھی۔ چنانچہ اسکے متعلق ۱۳ فروری سنہ ۱۹۰۱ء کے ایک خط مین مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کو تحریر فرماتے ہین ناصر خسرو کا سفرنامہ یا اُس کا ترجمہ چھاپنے کی اجازت یا ممانعت کرنے کا مجھے کچھ حق نہین آپ ضرور اس کا ترجمہ چھاپیئے مگر اسمین نوٹون کی بہت ضرورت ہوگی امید ہے کہ آپ اس فرض کو بخوبی انجام دینگے۔ مین نے جو اس کے اول مین ناصر خسرو کا حال فارسی مین لکھا ہے اس مین سخت محنت

جسکے ساتھ حکیم موصوف کا سفرنامہ بھی ہے جو ١٣٠٢ھ میں شائع ہوئی ہے اس کے علاوہ نثر کے اور بھی نمونے ہیں جو زیادہ تر دواوین کی تقاریظ کی صورت میں ہیں

فارسی نظم بھی لکھتے تھے۔ ان نظموں میں ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خان شاہ افغانستان کے ورود کالج کے موقع پر جو قصیدہ مولانا نے لکھا تھا وہ ہر اعتبار سے بے بدل ہے اس میں بھی مولانا کا خاص رنگ موجود ہے اور بیجا مدح سرائی سے احتراز کیا گیا ہے۔

مولانا نے ایک ال نامہ بھی شروع کیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ختم نہیں ہوا۔ اس میں کے چند جملے انھوں نے ١٩١٠ء میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اردو کو ایک خط میں لکھے تھے جو اس موقع پر دلچسپی کے لئے ہی نہیں بلکہ مولانا کے خیالات پر عبور حاصل کرنے کے لئے درج کئے جاتے ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۔ اور تلاش مجھ کو کرنی پڑی ہے میں بہت خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ آپکے نزدیک اگر وہ تحقیقات صحیح ہو تو اس کا ترجمہ بھی سفرنامہ کے اول میں چھاپ دیجئے" مولانا نے اس خط میں مولوی عبدالرزاق صاحب کو جو ہدایت کی تھی الحمدللہ کہ اس کے مطابق انہوں نے سفرنامہ کا ترجمہ کیا اور تمام کتاب پر مفصل نوٹ لکھے اور یہ سفرنامہ عنقریب پریس میں جانے والا ہے۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

"اس میں ہر فرقہ اور ہر گروہ پر چوٹ ہے اور بہ لطافت پیرایہ میں فیکٹیں بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) المذہب، اعلان جنگ (۲) الدین، تقلید آبا و اجداد (۳) العلم، قسمے از جہل مرکب (۴) الامتحان، آزمائش لیاقت ممتحنان (۵) الیونیورسٹی، کارخانہ کلرک سازی (۶) المسلمانان ہند، چون بارگزیدہ از زیستان ترسندگان (۷) العلیگڈہ پارٹی، شہید وفا (۸) العلیگڈہ کالج، پرورشگاہ طفلان بدست مائندران (۹) الانجمن ہائے اسلامیہ، سبزہ پژمردگان (۱۰) الاتفاق در مسلمانان، چون اجتماع در نقیضین (۱۱) الرئیس۔ آنکہ از ریاست بے خبر باشد (۱۲) الامیر۔ آنکہ شکم پرست و قرضدار باشد (۱۳) المولوی، آنکہ مسلمانان را از دائرہ اسلام خارج مے کردہ باشد (۱۴) الواعظ، آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند (۱۵) الشکار، بہانہ آدم کشی (۱۶) الکمیشن، وجہ موجہ برائے فیصلہ یکطرفہ (۱۷) النیشنل کانگرس، در حق تعلیم ہند چون بغاوت ۱۸۵۷ء در حق اسلحہ اہل ہند

مولنا کو عربی علم ادب کا شوق جہانگیر آباد مین پیدا ہوا اس کی نسبت خود تحریر فرماتے ہین کہ "ادب عربی کسی با قاعدہ استاد سے نہین پڑہا تھا نہ کسی ادیب سے اصلاح لی تھی مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی لغات کی مدد سے آسان آسان کتابین دیکھنے لگا اور فارسی اُردو کے علاوہ عربی نظم و نثر مین بہی حیناً فحیناً خامہ فرسائی کرتا رہا" اس مطالعہ سے ان کو عربی علم ادب پر بہی کافی قدرت حاصل ہو گئی تھی اور چونکہ مصر و بیروت وغیرہ مین جو نئی کتابین شایع ہوتی تھین اُن کو منگواتے اور دیکھتے رہتے تھے اسلئے ان کا عربی ادب بہت بلند ہو گیا تھا عربی مین شعر بہی کہتے تھے لیکن کم البتہ نثر کا حصہ زیادہ تھا ۱۸۹۴ء مین "حیات جاوید" کی تصنیف کے ساتھ ہی ساتھ سرسید کے بڑے بڑے کام اور کسی قدر اُن کی زندگی کا حال عربی مین بہی لکھنا شروع کیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے وہ اس کام کی تکمیل نہ کر سکے۔

۱۹۱۳ء مین جبکہ اُن کو زندگی کی طرف سے ایک حد تک مایوسی ہو گئی تھی انھون نے اپنے فارسی اور عربی کلام کا مجموعہ پریس مین طبع ہونے کے لئے بھیجا تھا۔

اس شہرت علمی اور قبولیت عام کے علاوہ جو مولانا کو علمی حلقون مین

ہی نہیں بلکہ طبقہ عوام میں بھی حاصل تھی سلطنت کی طرف سے بھی انکی عالمانہ قابلیت اور علمی خدمات کی قدر شناسی کی گئی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں ان کو "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا گیا۔

(۶)

ان خدمات قومی کے ساتھ مولینا نے اپنے وطن میں جو تعلیمی خدمات انجام دیں وہ بھی نہایت قیمتی ہیں اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ علی العموم قصبات میں شرفا کی آبادی زیادہ ہوتی ہے اور ان کی تباہی بربادی کے نظارے بھی وہیں زیادہ نظر آتے ہیں پانی پت کی قدیم عظمت سے قطع نظر کر کے اس وقت بھی وہ ایک مشہور قصبہ ہے جہاں زیادہ تر شریف خاندان آباد ہیں اور ہمیشہ وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا ہے وہاں کے حفاظ تمام ہندوستان میں مشہور ہیں لیکن انگریزی تعلیم کا بجز چند گھروں کے چرچا نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو پانی پت سے باہر ابتدائی تعلیم کے مصارف کا تحمل نا ممکن تھا مولینا نے اس کمی اور نقصان کو محسوس کر کے اپنی ذاتی سعی و کوشش سے سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک مڈل اسکول قائم کرایا اور جب اس کی طرف سے کسی قدر اطمینان ہوا تو باشندوں میں علمی مذاق قایم رکھنے کے لئے ایک پبلک لائبریری کی بنیاد ڈالی اور عرصہ تک اس کا اہتمام اپنے ہاتھ

میں رکھا اور بہت نادر اور عمدہ کتابیں اسکے لیے فراہم کرتے رہے ۔
جب مڈل اسکول اچھی طرح چلنے لگا تو اس کو ہائی اسکول کے درجہ پر پہنچانے
کی کوشش کی چندوں کی وصولی اور سرمایہ کی فراہمی کے لئے قریب وجوار
کے مقامات کے دورے کئے اب وہ حالی میموریل ہائی اسکول کے نام
سے قائم ہے اور ان کے قابل فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب کی نگرانی
میں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے ۔

مولانا کو صرف لڑکوں کی ہی تعلیم اور حالت پر توجہ نہیں تھی بلکہ
وہ لڑکیوں کی تعلیم کو بھی ضروری جانتے تھے اپنے خاندان کی
لڑکیوں کو تعلیم دلانے پر اکثر اپنے اعزا کو توجہ دلاتے رہتے تھے
لیکن اس طرح جدا جدا ہر گھر میں تعلیم کا انتظام بہت مشکل تھا
اس لئے انھوں نے سنہ ۱۸۹۵ء میں ایک زنانہ مدرسہ بھی قائم کرایا
اور اس کا انتظام و اہتمام اپنے ہاتھ میں رکھا

(ک)

مولانا نے ایک عرصہ تک مختلف امراض میں مبتلا رہ کر کبھی کم
اور کبھی زیادہ تکالیف اٹھائیں علاج بھی ہوتا رہا لیکن اقتضائے
عمر کے ساتھ امراض کے سلسلہ میں اضافہ اور شدت ہی ہوتی رہی
اور آخر سنہ ۱۹۱۴ء میں ۹ دن کی سخت تکلیف کے بعد قرآن مجید سنتے

سنیچر (۱۳ محرم ۱۳۳۳ھ ۱۳ دسمبر) کو اونکی روح نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اُنھون نے اس درد والم سے نجات حاصل کی جس نے ۴۰ سال سے اون کے رگ وپے مین سرایت کرلی تھی اور اون کے وجود کو درد کا ایک مجسمہ بنادیا تھا۔ مرحوم نمازِ جنازہ کے بعد جس مین شہر کے ہر طبقہ کے مسلمان بہ کثرت شریک تھے پانی پت کی مشہور درگاہ قلندر شاہ مین دفن کیے گئے۔"

حالی کی قبر پر

سید ہاشمی فرید آبادی

اے جسمِ گرانمایہ والے روحِ معزز!
یہ مسکنِ عزلت تجھے کس طرح سے بھایا؟

تو وہ کہ ترا غلغلۂ اسمِ گرامی
اک کشورِ اعظم کی حدون مین نہ سمایا

اُتر کی فضا گونج گئی تیری نوا سے
دکھن کی ہواؤن نے ترانہ ترا گایا

مہتاب کی مانند ترے فیض کا پرتو
ہر سمت گیا پھیل، ہر اک خطے پہ چھایا

کیا چیز تھی اے خاک نشین! تجھ مین کہ جس نے
رتبہ ترا افلاک سے رفعت مین بڑھایا؟

ورثے مین ملی تھی نہ کوئی جاہ و امارت
کچھ دولتِ دنیا تھی ترے پاس نہ مایا

ہان درد کہ ہے بلبلِ غم دیدہ کا حصہ
مقسوم مین تھا تیرے دلِ نرم کے آیا

ہو سکتی نہ تھی ورنہ یہ تاثیر جگر دوز ہر بول میں ہے راگ میں، جو تو نے سنایا

مانا کہ وہ موضوع بہت درد بھرا تھا جس پر قلمِ نوحہ رقم تو نے اٹھایا
مانا کہ لکھے مرثیے اس قوم کے تو نے گیتی نے ابھی خاک میں تھا جس کو ملایا
وہ نعش، مگر، عالمِ غربت میں پڑی تھی تھا سوگ میں جس کے کوئی اپنا نہ پرایا
یاد آئے تجھے اب جس کے فضائل [illegible] اس عالمِ ناقدر نے تھا جس کو بھلایا

ہاں تو نے کیا نام کو اسلام کے زندہ اک عہدِ فراموش کو پھر یاد دلایا
پھر کیا ہے کہ اک ملتِ خفتہ کو جگا کر خود موت کی چادر میں جو منہ تو نے چھپایا؟
کیا مشعلِ رہ کی نہیں اب ہم کو ضرورت؟ کیا ہم پہ اب اقبال کا پھر آگیا سایا؟
کیا مرگ تری شمعِ شبستاں کا ہے بجھنا؟
کیا میں یہ یقیں کر لوں کہ وقتِ سحر آیا؟

بھوپال

زبیری

محمد امین مارہروی

۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

علیگڈھ کے بعد اس صوبہ میں سب سے قدیم اور مشہور اسلامی مدرسہ ہے جہاں تعلیم ذہنی کے ساتھ مذہبی اور جسمانی تربیت کا بھی بہترین انتظام ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے طلبا یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ دارالاقامہ میں متعدد قابل استاد اور علماء بچوں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ مفصل حالات کے لئے دستورالعمل طلب فرمائیے۔

محمد الطاف حسین بی اے (علیگ)

ہیڈ ماسٹر

عااس

(زر، ورث)

۸۹۱۵۶۳۱۴

DUE DATE

R. D. 4/40 26/2/73			

Date	No.	Date	No.
R.D 9/90			